ادبی ترجمہ کے مسائل۔ ڈاکٹر عبدالحکیم حسان☆ عمر کی آراء کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر امتیاز احمد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی وعلومِ اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Translatuion is one of the most important area in literature. There are different methodologies of translation. In this article, the debates of Dr. Abdul Hakeem Hasaan about translation has been analysed.

عہد بابل میں جب زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے لِسانی اختلاف پیدا ہوا تو باہمی افہام وتفہیم کی راہ مسدود ہونے لگی، چنانچہ ایسے ذرائع دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو دیگر معاشروں کے حالات، اقدار، انداز فکر، ثقافتی نیز ادبی اطوار سے آگاہی میں سہولت پیدا کریں۔ اس سلسلے میں عمل ترجمہ، انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی شناخت کا ایک بھرپور ذریعہ ثابت ہوا۔

ابتداء میں اہلِ روم نے ترجمہ کی طرف توجہ دی اور یونانی ورثہ کو لاطینی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جس کی بدولت ان کی تہذیب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ بعدازاں مغربی یورپ میں قدیم علمی ورثہ کو لاطینی سے زمانۂ حال کی زبانوں میں منتقل کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی گئی جس نے جدید تہذیب کی تشکیل میں اساسی کردار ادا کیا۔

اسلام کی آمد کے بعد ترجمہ کے فن کو خصوصی اہمیت ملی جس سے جہاں اس دین کی اشاعت میں مدد ملی وہیں مسلمانوں نے بیک وقت دو عظیم ثقافتوں سے بھی استفادہ کیا۔ ان میں سے ایک تو ھلیلی (یونانی) ثقافت ہے جس کی عمر کم وبیش ایک ہزار سال بنتی ہے اور دوسری کا تعلق فارس سے ہے جس میں ھندی اور چینی تہذیبوں کے عناصر بھی شامل تھے۔[۱]

عہد عباسی (۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء) میں سب سے اہم مترجم عبداللہ بن مقفع تھا جس نے سنسکرت 'پنج تنتر'، اور پہلوی 'کلیک و دمنک' کا عربی میں ترجمہ کر کے 'کلیلہ و دمنہ' رکھا۔ اس کے فارسی سے کیے ہوئے دیگر تراجم میں ایرانی تاریخ کی نادر کتابیں خصوصاً 'آئین نامہ'، 'یزدک نامہ'، نوشیرواں نامہ' یادگار ہیں۔ جبکہ ابنِ رشد نے ارسطو کے فلسفیانہ رسائل کو عربی کا جامہ پہنایا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے 'بیت الحکمت' کی بنیاد رکھی تو اس میں دارالترجمہ بھی قائم کیا۔ ہارون الرشید کے عہد میں فارسی اور

☆ ڈاکٹر عبدالحکیم حسان عمر مصری، ۱۹۶۵ء انگلستان سے ڈاکٹوریٹ کیا، قاہرہ یونیورسٹی (مصر) اور جامعہ اُم القریٰ (مکہ مکرمہ) میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ آپ نے متعدد تحقیقی کتب لکھی ہیں اور آپ کے علمی مقالات مختلف بین الاقوامی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

یونانی زبانوں کی تصنیفات کا ترجمہ کیا گیا۔اس ضمن میں فضل بن نوبخت مجوسی اور یوحنا بن ماسویہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ مامون الرشید کا زمانہ عربی تراجم کی تاریخ کا سنہرا دور تھا۔ بقول شبلی نعمانی:

''ہر ہر بات میں وہ شاہانِ عجم کی تقلید کرتا تھا اور اردشیر کی آئینِ سلطنت اس کا دستور العمل تھا''۔

فلسفے سے اس کی رغبت کا مظہر اس کا وہ مکتوب ہے جو قیصرِ روم کے نام ہے۔اس میں اس نے لکھا تھا کہ ارسطو وغیرہ کی جس قدر کتابیں بہم پہنچا سکیں، پہنچائی جائیں۔ مامون رشید کا مشہور ترین مترجم حنین بن اسحاق تھا جس نے جالینوس کی ۱۲۱ کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ مکمل کیا تھا۔ دیگر عظیم مترجمین میں یعقوب کندی، سہل بن ہارون اور قسطا بن لوقا شامل ہیں جنہوں نے سنسکرت اور یونانی فلسفہ نیز یونانی علوم وفنون کے تراجم کیے۔اس دور میں مہاندس محمد ابن ابراہیم فزاری نے زیج کی مشہورِ زمانہ تصنیف 'سدھانت' از برھم گپت کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ مکمل کیا۔[۲]

فارسی، سنسکرت، سریانی، یونانی نیز لاطینی زبانوں سے قدیم عرب کے جن اہل زبان وفن نے ترجمے کیے ان کے ناموں اور کارہائے نمایاں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مامون الرشید سے پہلے عربی میں لفظی ترجمے کا رواج تھا اور کتاب (اصل متن) کی مشکلات ترجمے میں قائم رہتی تھیں۔ اس مشکل کو اس دور کے مشہور ترین مترجم حنین بن اسحاق نے دُور کیا اور مامون الرشید نے اس کی ہر تصنیف (ترجمہ) کے برابر سونا تول کر دیا۔حنین نے اڑتالیس برس تک مامون الرشید کے لیے ترجمے کا کام کیا۔ پھر خلیفہ واثق باللہ نے اپنے عہد میں اسے دارالترجمہ کا مہتمم مقرر کیا۔ جبکہ اسی زمانے میں موسیٰ بن خالد جیسا عظیم مترجم بھی وہاں ترجمے کے کام پر مامور تھا۔[۳]

فنِ ترجمہ سے متعلق سوالات میں سے اہم ترین یہ ہیں کہ ترجمہ کیا، اصل کی جملہ خصوصیات کو بعینہٖ منتقل کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوسکتا ہے؟ مزید برآں وہ اصل سے متعلق فکری اور ثقافتی و ادبی رجحانات کو کتنی ذمہ داری سے منتقل کرسکتا ہے؟اس بارے میں مشہور ادیب جاحظ (۷۷۵ء - ۸۶۸ء) نے خیال پیش کیا کہ دو وجوہات ایسی ہیں جن کی بناء پر مکمل امانتداری سے ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے جو کہ یہ ہیں:

(۱) مترجم اجنبی زبان سے بھی اتنا ہی واقف ہو جتنا کہ وہ اپنی مادری زبان کا تسلی بخش علم رکھتا ہے۔عام مشاہدہ یہ ہے کہ متعدد زبانیں جاننا سابقہ آموختہ کو متاثر کرتا ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ

ان تالیف کتابٍ ردی ءٍ خطأ، امّا ترجمة کتاب جید ترجمة ردیئة فجریمة.

غیر معیاری کتاب کی تالیف ایک غلطی ہے لیکن عمدہ کتاب کا غیر معیاری ترجمہ بھی ایک جُرم ہے۔

(۲) مترجم بھی اس علم پر عبور رکھتا ہو جس سے متعلق تصنیف کا وہ ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔[۴]

آل احمد سرور نے انہی دو باتوں پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ مترجم موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور اپنی زبان کے سرمائے پر بھرپور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمائے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جا بجا ٹھوکریں کھائے گا۔[۵]

یہی وجہ ہے کہ تیسری صدی ہجری میں جن لوگوں نے یونانی ورثہ کا عربی میں ترجمہ کیا، انہیں ارسطو، افلاطون وغیرہ کا ہم پلّہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ چنانچہ یونانی ڈرامے کے دقیق تصورات و روایات سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارسطو کی تصنیف

''فنِ شاعری'' کا عربی میں ترجمہ کرنے والے نے comedia کو ہجو اور tregedia کو مرثیہ قرار دیا۔ ۶

ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے بھی مترجم کے لیے جاحظ کی مقرر کردہ شرطِ اول کی تصدیق یوں کی ہے:

''اسے اس زبان پر مہارت ہونی چاہیے جس سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اور خود اپنی زبان پر بھی''۔ ۷

ترجمہ نگاری میں ایک مشکل مرحلہ تب آتا ہے جب اصل کی رُوح برقرار نہ رہے یا اس کا بھرپور اعادہ ممکن نہ ہو، اسی طرح کی صورتحال اس وقت پیش آتی ہے جب کسی شعری فن پارہ کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہو کیونکہ اس عمل کے دوران یا تو حلاوتِ موسیقی یا اسلوب کی سلاست میں کمی واقع ہونے کا امکان موجود ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر 'ہومر' کا یونانی سے ترجمہ نہیں ہو سکا۔ اور یہی کچھ مزامیر کے ساتھ ہوا کہ ان کو ابتداء میں عبرانی، پھر یونانی اور آخر کار جب لاطینی میں منتقل کیا گیا تو اصل کی سلاست اور موسیقیت جاتی رہیں۔

لوڈوویکو اریسٹو (۱۴۷۴ء۔۱۵۳۳ء) مشہور اطالوی شاعر ہے۔ اس نے عربی قصیدہ کو اطالوی زبان میں منتقل کیا تو یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ قصیدہ اپنی اصل زبان میں ہی خوبصورت تھا، اور اس کی فنی قدر و قیمت ترجمہ میں منتقل نہیں ہو سکی۔ ۸

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترجمے میں سلاست و روانی پیدا کرنے والے طریقوں کو ثانوی مقصد قرار دیا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق مترجم کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرزِ ادا کا خیال رکھے۔ لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنیٰ ادا کرنے والے الفاظ سے نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکب بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے ترجمے سے آخر کیا فائدہ جو سلاست و روانی تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح، اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے۔ ۹

ڈاکٹر عبدالحکیم کے مطابق ترجمہ کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے زبانوں میں موجود چند امتیازی خواص کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جیسے دلالتِ الفاظ، اقسامِ جملہ، عناصرِ جملہ میں باہمی ربط وغیرہ، بصورتِ دیگر اجنبی زبان میں معنیٔ مخصوص کی ادائیگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں کچھ تغیر نہ کیا جائے۔ ان کے علاوہ دورانِ ترجمہ جن دیگر عوامل کا پیشِ نظر رکھنا بھی ناگزیر ہے وہ یہ ہیں: ادیب کے طرزِ تحریر کی خصوصیات، ذھنی اپچ، جذباتی میلانات، زندگی اور انسان سے متعلق اس کا رویہ۔ ۱۰

غفران الجیلی نے تاریخ زبانِ انگریزی کے مصنف البرٹ۔سی بش کے حوالے سے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کسی فن پارے یا ادبی تخلیق کے مافیہ کو ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج، اپنا آھنگ اور اسلوب و پیرایہ بیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں روز مرہ، تشبیہات، محاورات، ضرب الامثال، استعارات و کنایات، مخصوص معارتی، معاشی، تاریخی اور سیاسی زندگی کی نمائندگی اور تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔ ۱۱

ڈاکٹر عبدالحکیم کے خیال کے مطابق مترجم کے لیے جہاں ترجمہ کو قاری کے لیے قابلِ فہم بنانا بھی ضروری ہے وہیں اسے مؤلف کا قرب حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسے مؤلف کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اس کے تجربات سے آگاہ ہو سکے۔ اسے اپنی زبان میں ہر واقعہ اور موقع کی تعبیر کما حقہٗ، کرنی چاہیے۔ اصوات، خوش آہنگی، اشارات، ترنم، رنگ

اور اصل معنی سے متعلق ہر شے کی وضاحت کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب پر قدرت ہونی چاہیے۔۱۲
مسکین حجازی نے اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مترادفات سے کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک لفظ ہی موزوں ترین ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اچھا مترجم وہی ہے جو موقع کی مناسبت سے موزوں لفظ کا انتخاب کرے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب مختلف لغات مترجم کے زیرِ مطالعہ رہیں۔۱۳

اس سلسلے میں ہاشمی فرید آبادی کی رائے قابلِ ذکر ہے:

> ''انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گُر مترجم کو سیکھنا لازمی ہے کہ 'جو'، 'جس' اور 'جن' سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے۔ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان مین ربط وضبط کی دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بیان کے متین وشگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں۔۔۔ البتہ انہیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند، اور اپنے معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے''۔۱۴

ترجمہ کرتے وقت جہاں مواد کا انتخاب اہمیت کا حامل ہے وہیں پر ترجمہ نگاری کو اپنے معاشرے کی مذھبی، فکری، سیاسی اور معاشرتی صورتحال کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے برسوں انگلستان میں بھی مقبول رہے، اور انگلش تھیٹریکل گروپس یورپ کے مختلف حصوں میں عوام میں گھوم پھر کر انہیں پیش بھی کرتا رہا، لیکن کسی یورپی قوم نے ان کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر کار یورپ میں ادب کی رومانی تحریک نے جنم لیا جو باعتبارِ روح شیکسپیئر کی تصنیفات سے زیادہ قریب تھی۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ میں ان ڈراموں کو عوام میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔۱۵

مرزا حامد بیگ نے اس صورتحال پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

> ''میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ادیبوں کو اوائل بیسویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا بن کر ہی ترجمے کی طرف آنا چاہیے تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں زرق برق مغربی تہذیب اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی اور سیاسی حوالوں، ذہنی رویوں، ضرورتوں اور انگریزی زبان نیز مغربی ادبیات کے مخصوص پس منظر میں رکھ کر کرنا چاہیے تھا''۔۱۶

شاعری کی چند امتیازی خصوصیات ہیں جن کی بناء پر ہم اسے نثر سے الگ پہچانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعری انتخاب کا ترجمہ ترجیحاً منظوم شکل میں کرنا چاہیے۔ بعض محققین کا موقف ہے کہ وزن اور قافیہ کو بھی جوں کا توں رکھنا چاہیے۔ تاہم اس شرط کا اطلاق مشترک ورثہ اور عروض کی حامل زبانوں پر تو ہوتا ہے لیکن باہم مختلف ثقافتی میراث کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی زبانوں پر نہیں۔ مثلاً عربی قصیدے کے وزن اور قافیہ کو ہو بہو برقرار رکھنا ممکن نہیں جس وقت اس کا انگریزی، فرانسیسی یا کسی اور یورپی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ Divine Comedia کے ساتھ پیش آیا کیونکہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت محسوس ہوا کہ اصل کی عروض کو اطالوی زبان کے اسلوب کی خصوصیات سے باہم ملانا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ Divine Comedia کی قافیہ آرائی بہت پیچیدہ ہے جسے انگریزی زبان قبول نہیں کرتی۔۱۷

مذکورہ رائے کے بالمقابل ایک گروہِ مترجمین ایسا بھی موجود ہے جو شعری انتخاب کو نثری انداز میں ترجمہ کرنے کو حق

بجانب سمجھتا ہے۔ Euripides (۴۰۶-۴۸۰ ق۔م) نے اسّی ۸۰ کے قریب المیہ (Tragic) ڈرامے تحریر کیے۔ ان المیہ ڈراموں کے ترجمے اس نہج پر کیا گیا کہ قصیدے کی بحروں کی پابندی کرنے کی بجائے شاعری اور نثر کو باہم ملایا گیا تا کہ مکالماتی اور غنائی عبارتوں کا امتیاز ظاہر کیا جا سکے۔ یا جب مقفی ابیات کو غیر مقفّی عبارت میں منتقل کیا جائے تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کرنے میں آسانی ہو۔ مترجمین نے مذکورہ المیہ ڈراموں کے یونانی سے قریب تر اوزان کے استعمال کا طریقہ آزمایا تا کہ جذباتی اور اطلاقی معانی کے ابلاغ کا اساسی ہدف حاصل کیا جا سکے۔ ۱۸

Virgil (Publius Vergillus Maro)(70-19B.C) کی وجہ شہرت اس کی رزمیہ Aeneid ہے جس میں Troy کی لڑائی کے بعد پیش آنے والے واقعات مذکور ہیں۔ اس کا ترجمہ کرنے والوں نے بھی محسوس کیا کہ وزن اور قافیے کی پابندی کرنا ممکن نہیں۔ ۱۹

رزمیہ جیسی صورتحال ڈرامہ کے ساتھ بھی پیش آئی جو اٹھارویں صدی تا ہنوز شعر و نثر دونوں پیرایوں میں تخلیق کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے منظوم ڈراموں کا جب ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی تو وزن اور قافیہ کو ملحوظ خاطر رکھنا طول از کار نظر آنے لگا۔ چنانچہ نہ صرف مذکورہ شرائط کو نظر انداز کرنا پڑا بلکہ قدیم ڈرامے کی کئی لغوی اور ادبی خصوصیات کو بھی ترک کر دیا گیا۔

''احمد رامی''۔۔۔۔ نے رباعیاتِ عمر خیام کو عربی زبان میں ڈھالا تو اصل فارسی متن کو برقرار رکھنے کی غرض سے عربی و فارسی کی مشترک عروض کا استعمال کیا۔ تاہم جب اس نے یہ کوشش کی کہ قریب تر معنیٰ حاصل ہو سکے تو بہت سی رباعیات میں سے اضافہ یا حذف یا تحریف کا ارتکاب کرنا پڑا۔ اور یہ قریب تر معنیٰ بھی غیر مطابق ہو گیا۔ ۲۰

ترجمہ کرنے والوں میں سے بعض ایسے ہیں جو متن کی پرواہ ایک حد تک ہی کرتے ہیں مگر اپنی زبان میں ایک طاقتور اسلوب پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر بہت دور تک جاتا ہے۔ اس عمل کو اصطلاحاً توضیحی ترجمہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً نادر کاکوری کا ایک مشہور ترجمہ: ''گزرے ہوئے زمانے کی یاد'' ٹامس مور کی نظم The Light of other Days کا ترجمہ ہے۔ متن سے زیادہ قریب نہ ہوتے ہوئے بھی اسی ترجمے کا جادو آج تک سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ترجمہ دیکھئے:

اکثر شبِ تنہائی میں
کچھ دیر نیند سے پہلے
گزری ہوئی دل چسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی
وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے

وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ عہدِ وفا
وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب
یاد آتے ہیں ایک ایک سب
دل کا کنول جو روز و شب
رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے
اک سبزہ پامال ہے
اک پھول کُملایا ہوا
ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر[۲۱]

اقبال نے ٹینی سن ، لانگ فیلو اور ولیم کاؤپر کی متعدد نظموں کے ترجمے کیے جن میں ''پیامِ صبح''، ''پرندہ اور جگنو'، ''پرندے کی فریاد' اور ''ماں کی تصویر دیکھ کر' تینوں نظمیں ولیم کاؤپر سے ترجمہ ہیں۔ اقبال نے مذکورہ نظمیں اتنی خوبصورت اخذ کی ہیں کہ ان کی اپنی تخلیقات بن گئی ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موصوف نے اپنی زبان میں ایک جیتا جاگتا اسلوب پیدا کر دیا ہے جبکہ متن کی پروا ایک خاص حد تک کی ہے۔[۲۲]

منظوم تراجم میں خود مترجم کی شخصیت بھی خاصا دخل رکھتی ہے۔ اس کی مثال لارڈلٹن کی ایک نظم کا اردو ترجمہ ہے۔ مذکورہ ترجمہ حسن الدین احمد نے ''سازِ مغرب'' کی جلد دوم میں ''اندھی نابینا پھول والی کا گیت'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ مترجمین میں محمد حسین آزاد، سرور جہاں آبادی، سیّد محمد ابراہیم رشک، اشک بلند شہری اور احسن لکھنوی شامل ہیں۔ اس طویل نظم کے صرف ایک شعر پر نظر ڈالنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بحر و آہنگ اور نظم کی ہیئت سے لے کر مضامین و تخیلات تک ہر طرح کا اختلاف موجود ہے:

لوگو میرے پھول خریدو
کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو

(محمد حسین آزاد)

لوگو، چلو مرے گلِ رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

(سرور جہاں آبادی)

میں پھول بیچنے لائی ہوں لو، پریزادو
بن آنکھوں والی سے ان کو نجات دلوادو

(سیّد محمد ابراہیم رشک)

خریدو پھول میرے لینے والو
ذرا ان کی بہاروں کا مزا لو

(اشک بلند شہری)

گو وہی مالن کی ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول
گو وہی مالن کی ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول

(احسن لکھنوی) ۲۳؎

شاعری کے شہ پاروں کے ترجمہ سے متعلق بحث سے یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ نثری انتخابات کا ترجمہ مسائل سے پاک ہے۔ مثلاً افلاطون کی Republic کے مترجم نے محسوس کیا کہ اصل کے امتیازی پہلو dialogue کی روح کو برقرار رکھنا نہایت مشکل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو فقرات کے معمول سے ہٹ کر طوالت ہے اور دوسری وجہ وہ تجریدی و اخلاقی اصطلاحات ہیں جن کا ترجمہ کرنا کلام کا تسلسل ختم کرنے کا باعث بنتا ہے اور خود قاری کے لیے بھی ناقابلِ فہم بن جاتا ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ پیش کیا گیا کہ سب سے افلاطون کی بات کا پس منظر تلاش کیا جائے، اور پھر اس کی روشنی میں مراد کو سمجھا جائے، اور آخر میں اس فکر کی اس انداز میں وضاحت کی جائے جیسا کہ خود افلاطون دورِ حاضر کے مخصوص حالات کی روشنی میں اس کی توضیح کرتا۔ ۲۴؎

مسکین حجازی نے اس مسئلے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

علمی اصطلاح کے ترجمہ کے ضمن میں ایک طریقِ کار یہ بھی ہے کہ اس کا ترجمہ اصطلاح ہی میں کیا جائے۔ اگر اصطلاح نئی ہو تو مسلمہ اصولوں کے مطابق نئی اصطلاح وضع کی جائے۔ اس کے لیے اصطلاحات پر مشتمل لغات استعمال کرنی چاہئیں۔ ۲۵؎

۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ کا قیام ہوا تو وضعِ اصطلاحات کے لیے ایک مجلس بنائی گئی جس نے یہ اصول طے کیا کہ وضعِ اصطلاحات کے لیے ماہرینِ زبان اور ماہرینِ فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے تاکہ جو اصطلاح بنے وہ زبان کے سانچے میں ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے ناموزوں نہ ہو۔ حتی الامکان ایسے مختصر الفاظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کرسکیں۔ قدیم کارآمد اصطلاحیں برقرار رکھی جائیں لیکن جو صحیح نہیں ہیں، یا صحیح ہیں لیکن مشتقات کے لیے مناسب نہیں ہیں انہیں بدل دیا جائے۔ ۲۶؎

ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے بھی اصطلاحات کے ضمن میں یہ بات واضح کی ہے کہ ان کے ترجمے میں معاشرتی چلن، سماجی سہولیات اور عوام الناس کے مزاج اور دوسری زبانوں کو قبول کرنے کے لیے ان کی سہولت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اسی طرح ہر ایک شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے ترجمہ کے سلسلے میں بھی ان شعبوں کے سیاق و سباق کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً

میل (Mail) کا لفظ محکمہ ریلوے، محکمہ ڈاک سے لے کر E-Mail (الیکٹرانک میل) تک یہ اصطلاح مختلف کاموں اور صورتوں کے لیے بولی جاتی ہے۔ ۲۷

ادبی تراجم کے سلسلے میں پہلا مسئلہ، جسے مترجمین نے اکثر ملحوظ نہیں رکھا، مقصد کا تعین ہے۔ ترجمے کی غایت دو طرح کی ہوسکتی ہے۔ ایک عالمی یا مکتبی (Academic) اور دوسری خالص ادبی۔

پہلی قسم کا ترجمہ آپ کو اصل ادب پارے کے موضوع و مفہوم، ہیئت، مفاہیم، افکار و تخیلات سے متعارف کرا سکتا ہے، لیکن بجائے خود ادب پارہ شمار نہیں ہوسکتا۔

دوسری غایت ادبی ہوسکتی ہے یعنی اپنے ادب میں اصل ادب پارے کا جواب پیدا کرنا جو بجائے خود ایک ادب پارہ اور اس زبان کے ادب میں ایک اضافہ سمجھا جائے جس میں ترجمہ کیا گیا۔

ترجمے کی غایت متعین ہو جانے کے بعد اگر علمی یا افادی ترجمہ مقصود ہو وہ دو طرح کا ہوسکتا ہے: ایک کم و بیش لفظی، دوسرا جس میں محاورہ بدل جائے۔ نثری ترجمے میں اصل محاورے کی ترجمانی بھی اپنی جگہ ایک افادی پہلو رکھتی ہے۔۔۔ لیکن ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبارت تمام تر اپنے محاورے میں ڈھال لی جائے۔ ۲۸

عالمی سطح پر ترجموں کی چند ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جو اصل کے مساوی قرار دیئے گئے ہیں۔ ان میں زبان کی عمدگی، عبارت کی پختگی اور فکر کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ اس قسم کا بلند پایہ ترجمہ دوسری صدی ہجری/ اٹھاویں صدی عیسوی میں ''کلیلہ و دمنہ'' کے نام سے کیا گیا جو عربی زبان میں کیے گئے ترجموں میں سرِ فہرست ہے۔ مذکورہ کتاب ہندی زبان میں تھی۔ بعد ازاں عربی کے شہرۂ آفاق ادیب عبداللہ بن مقفع نے اس کتاب کا عربی میں ایسا ترجمہ کیا کہ جو اصل کا ہم پلہ اور ادب کا عالمی ورثہ بن گیا۔ کلیلہ و دمنہ کا دنیا کی جن دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اس کی بنیاد مذکورہ ترجمہ ہے۔ ابن مقفع نے ترجمے کے عمل میں چند اہم امور کو پیشِ نظر رکھا مثلاً لفظ بلفظ ترجمہ سے گریز کرتے ہوئے اصل کے اسلوب کو مختصر، متوازن اور واضح معنی رکھنے والے جملوں میں تبدیل کیا۔ اور کثرتِ افکار اور پیچیدہ تراکیب سے اجتناب کیا۔

اس طرح ابن مقفع نے ہی عربی نثر میں فنی انداز روشناس کرانے کی ابتدا کی۔ کلیلہ و دمنہ کے اصل متن میں کچھ ایسا مواد موجود تھا جو دوسری صدی ہجری کے مسلم معاشرہ میں رائج روایات سے متصادم تھا۔ اس کے کچھ آثار ''برزویہ'' کے مقدمہ میں دکھائی دیتے ہیں، جنہیں اس زمانے کے لوگوں نے ناپسند کیا۔ تاہم ابن مقفع نے اصل متن سے کُلّی طور پر انحراف کا طرز نہیں اپنایا حالانکہ اس کے عہد میں اصل متن کا پابند رہنا ترجمہ کی لازمی شرط نہیں تھی۔ ۲۹

عمر خیام (۱۱۲۳ء۔۱۰۵۰ء) ایک ماہر ریاضی دان تھا۔ تاہم اصل کی وجہ شہرت شاعری بنی جس میں اس نے یادگار رباعیات تخلیق کیں۔ انیسویں صدی میں ایک انگریز شاعر ایڈورڈ فٹنر جیرالڈ (۱۸۰۹ء۔۱۸۸۳ء) کو حیات اور بعد الممات سے متعلق چند اشکالات پیش آئے جن کے جوابات اسے مذکورہ رباعیات میں مل گئے۔ چنانچہ فٹنر جیرالڈ نے ان رباعیات کا ایسا منفرد ترجمہ کیا کہ جدید محققین یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ فٹنر جیرالڈ کی رباعیات، عمر خیام کی شاعری کا جدید سانچہ یا اس کے افکار کا اعادہ ہیں۔ مترجم نے اوّل رباعیات کی تعداد و ترتیب کو درست کرنے کی کوشش کی کیونکہ ایسی بہت سی رباعیات تھیں جو راویوں نے عمر خیام کی طرف منسوب کر رکھی تھیں۔ چنانچہ اس نے ان مذکورہ راویوں کی صحت کو جانچ پرکھ کر کی۔ دوم،

فٹز جیرالڈ کے زمانہ میں ادب میں رومانی تحریک عروج پر تھی جو کہ رباعیات کے فارسی متن میں موجود حیرت و شک پر مبنی روح کو انگریزی ترجمہ میں قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوئی۔ تاہم رباعیاتِ میں جاگزیں خیام کی صوفی فکر، یورپ کے رومان پسندوں کے اتحاد سے مختلف ہے۔۳۰؎

جرمن زبان میں شیکسپیئر کو آگسٹ ویلیہم شلیجل (August Welhelm Schelegel) (۱۷۶۷ء۔ ۱۸۴۵ء) نے متعارف کرایا۔ اس نے ۱۷۹۷ء سے ۱۸۱۰ء کی درمیانی مدت میں شیکسپیئر کے سترہ ڈراموں کا اس جرمن زبان میں ترجمہ کیا جو اس کے زمانے میں مروج تھی۔ اس طرزِ عمل کی بدولت جرمن قارئین کے لیے نہ صرف ان ڈراموں کو سمجھنا آسان ہوا بلکہ ان میں موجود جمالیات سے محظوظ ہونے کا موقع بھی فراہم ہو گیا۔ یہی ترجمہ اگر قدیم جرمن زبان میں کیا جاتا تو قاری کے لیے ان ڈراموں میں کوئی دلچسپی کا سامان نہ ہوتا کیونکہ وقت بدلنے سے خصوصیاتِ اسلوب اور علاماتِ تعبیر بھی بدل جاتی ہیں۔۳۱؎

مذہبی صحائف عالمی ادب کا ایک اہم حصہ اور ہر زبان کے اعلیٰ ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ اکثر انہیں ناقابلِ ترجمہ بھی شمار کیا جاتا رہا ہے۔ بعض اوقات ان کے ترجمے کی کوشش کو ایک طرح کی بے حرمتی بھی کہا گیا۔ انگلستان میں بائبل کے انگریزی ترجمے کی سختی سے مخالفت ہوئی۔ خود قرآن شریف کے ترجموں کی طرف بے رغبتی رہی اور ناظرہ پڑھنے ہی کو کافی سمجھا جاتا رہا۔ عبرانی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر مختلف زبانوں میں انجیل مقدس کے تراجم لازم آتے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اصل زبان سے بیگانگی کی صورت میں اہلِ عقیدت کو ترجمے کے ساتھ وہی لگاؤ پیدا ہو گیا جیسا کہ اصل سے تھا اور اس میں وہ سب محاسن نظر آنے لگے جو اصل سے منسوب تھے۔ چنانچہ انگریزی کا ''مصدقہ'' (اُردو) ایڈیزن جو ۱۶۱۱ء سے مروج جلد آرہا ہے ایسی ہی خوش عقیدگی سے پڑھا جاتا ہے جیسے کہ وہ اصل بائبل ہو اور ادبِ عالیہ میں تو اس کا شمار ہے ہی۔۔۔۔ بدھ مت کی ''دھم پد'' بھی ہر زبان میں اصلی سمجھی جاتی ہے۔۳۲؎

الیاس عشقی نے مسائلِ ترجمہ کو مجموعی طور پر یوں بیان کیا ہے:

> ''ترجمہ ایک دشوار فن سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بڑے بڑے مترجم اپنے کام سے خوفزدہ رہے ہیں۔ اس خوف کے کئی پہلو ہیں۔۔۔ مثلاً یہ کہ مترجم کے لیے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کتاب اور فن پارے کے مصنف کا ہو جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہو۔ مصنف تو جس زبان میں لکھتا ہے چاہے اس زبان کا ماہر ہو نہ ہو لیکن مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان زبانوں کا ماہر ہو۔ ایک وہ زبان جس کا ترجمہ کرنا ہے، دوسری وہ جس میں ترجمہ کرنا ہے۔ اس لیے اصل مصنف کے اندازِ بیان اور لسانی خصوصیات کے علاوہ، اس کے تعلیمی معیاروں، اس کے عام حالاتِ زندگی اور اس سے متعلق اس کا نقطۂ نظر اور عصری تقاضوں سے جس قدر واقفیت ہوگی اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔۔۔ دُنیا کے بہتر مترجم ان تمام خصوصیات پر پورا نہیں اُترتے۔۔۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترجمہ کا کام اگرچہ بنیادی طور پر ترجمانی ہے لیکن اس سادہ سے لفظ سے حقیقتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہوتی''۔۳۳؎

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ترجمہ کے باب میں درپیش مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ڈاکٹر عبدالحلیم نے چند نکات بیان کیے ہیں جن کی موجودگی میں مترجم اس عمل کو بحسن وخوبی سرانجام دے سکتا ہے:

(۱) ماضی میں علمی امانتداری، ترجمہ کی شرطِ لازم نہیں ہوا کرتی تھی لیکن عصرِ حاضر کی علمی روح اس کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا مترجم کو امانتداری اور لفظ بلفظ ترجمے کے مابین راہِ اعتدال اختیار کرنا چاہیے تا کہ جوہرِ اصل ضائع نہ ہو جائے۔

سیّد باقر حسین نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کر دیا جائے۔ اصل ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کر کے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیئے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ Labour کا ترجمہ عام حالات میں محنت مشقت کرنا ٹھیک ہے لیکن کہیں اسپتال کے Labour room کو محنت یا مشقت کا کمرہ نہ کہہ دیجئے گا۔[۳۴]

(۲) ترجمہ کرنے سے پہلے مواد کا انتخاب نہ صرف اس کی ادبی مقام کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے بلکہ مترجم کو اپنے معاشرے کی مذہبی، فکری، سیاسی اور معاشرتی صورتحال کو بھی خیال رکھنا چاہیے۔

(۳) مترجم کو ترجمہ طلب عمل کے ثقافتی ورثہ سے خوب آگاہ ہونا چاہیے تا کہ اس پر مؤلف کے اشارات وتلمیحات واضح ہوں۔

(۴) اتمامِ ترجمہ کی غرض سے زیرِ ترجمہ ادبی تخلیق کی زبان میں اسی قدر مہارت پیدا کی جائے جس قدر مترجم کو اپنی مادری زبان حاصل ہے تا کہ وہ اصوات، صوتی توازن، اشارات، تعبیرات، ترنم، رنگ غرض اصل معنی سے متعلق ہر شے کی توضیح کے لیے موزوں ترین الفاظ کا انتخاب کر سکے۔[۳۵]

ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے مترجم کے اوصاف، ایسے کے ضمن میں چند ایسے امور بیان کیے ہیں جو ڈاکٹر عبدالحلیم کے محولہ بالا شرائط کا تتمہ محسوس ہوتے ہیں مثلاً:

(۱) ایسی تحریریں جو بحیثیت قوم ہمارے مذہبی اور نظریاتی عقائد و جذبات کو مجروح کرنے کا باعث بنیں یا بحیثیت قوم ہمارے قومی تشخص کے لیے خطرے کا باعث ہوں ان کے تراجم فائدے کی بجائے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔

(۲) جس تخلیق کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کے پس منظر کو جاننے کے لیے، متعلقہ زبان و ادب میں اس کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کے لیے اور تخلیق میں موجود مخصوص الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کی تشریح وتوضیح کے لے تنقیدی و تحقیقی اندازِ نظر سے ہی کام لیا جا سکتا ہے۔

(۳) قدیم تخلیقی ادب کے مترجم کے لیے قدیم زبان سے مکمل آگاہی اور واقفیت ضروری ہے اور اگر ترجمے کے آخر میں ان قدیم الفاظ کے لیے زمانۂ حال میں استعمال ہونے والے الفاظ کی فہرست شامل کر دی جائے تو وہ ترجمے کی ادبی حیثیت میں اضافے کا باعث ہوگی۔[۳۶]

حواشی:

۱۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ماہنامہ الفیصل، سعودی عرب، ستمبر/اکتوبر، ۱۹۹۴ء، ص: ۳۹
۲۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ترجمے کا فن (نظری مباحث)، اسلام آباد، مقتدر قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص:
۳۔ ایضاً
۴۔ عبدالحکیم، حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۳۹۔۴۰
۵۔ آل احمد سرور، تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل، مشمولہ ترجمی: روایت اور فن، ص: ۱۶۴
۶۔ ایضاً، ص: ۴۴
۷۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن مشمولہ ترجمہ: فن اور روایت، مرتبہ نثار احمد قریشی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۶۹
۸۔ عبدالحکیم حسان عمر، ص: ۴۲
۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، کراچی، مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۲۲
۱۰۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۴۱
۱۱۔ غفران الجیلی، سید، فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات، مشمولہ ترجمہ: فن اور روایت مرتبہ: نثار احمد قریشی، ص: ۹۷
۱۲۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۴۰
۱۳۔ مسکین حجازی، فن ادارت، ص: ۲۹۶
۱۴۔ غفران الجیلی، سید، ترجمہ کے اصول و مبادیات، ترجمہ: فن اور روایت، ص: ۸۷
۱۵۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۴
۱۶۔ حامد بیگ، مرزا، اُردو بان میں ادبی تراجم کا جائزہ، مشمولہ اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص: ۸۲
۱۷۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۴۲-۴۱
۱۸۔ ایضاً، ص: ۴۳۔۴۲
۱۹۔ ایضاً، ص: ۴۲
۲۰۔ ایضاً، ص: ۴۳
۲۱۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن، مشمولہ ترجمہ: روایت اور فن، مرتبہ نثار احمد قریشی، اسلام آباد، مقتدررہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص: ۷۵۔۷۶
۲۲۔ مطفر علی سید، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، ص:
۲۳۔ حقی، شان الحق، ادبی تراجم کے مسائل، مشمولہ اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص: ۲۱۶

۲۴۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص:۴۳
۲۵۔ مسکین حجازی، فن ادارت، ص: ۲۹۵
۲۶۔ طارق محمود، اُردو کے سائنسی اور فنیاتی تراجم کا جائزہ، مشمولہ اُردو زبان میں ترجے کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص:۵۶-۵۵
۲۷۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، ترجمہ: فن اور اہمیت، اسلام آباد، ہائیر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۱۱، ص: ۳۱
۲۸۔ حقی، شان، الحق، ادبی تراجم کے مسائل، ص: ۲۱۸-۲۱۷
۲۹۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۴۱-۴۰
۳۰۔ ایضاً
۳۱۔ ایضاً، ص: ۴۰
۳۲۔ حقی، شان الحق، ادبی تراجم کے مسائل مشمولہ اُردو زبان میں ترجے کے مسائل، ص: ۲۱۳-۲۱۲
۳۳۔ الانا، غلام علی، ڈاکٹر، ادب میں تراجم کی اہمیت، مشمولہ اُردو زبان میں ترجے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، ص: ۲۵-۲۴
۳۴۔ باقر حسین، سید، ترجے کے اصول، مشمولہ ترجمہ: فن اور روایت، ص: ۵۹
۳۵۔ عبدالحکیم حسان عمر، ڈاکٹر، الترجمۃ الادبیۃ ومشکلاتہا، ص: ۴۴
۳۶۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، ترجمہ: فن اور اہمیت، اسلام آباد، ہائیر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۱۱، ص: ۸۹-۸۸

☆☆☆